Fikr-o-Nasar (Islamabad) 5:3 (1967)

شورائی نظام کا آخری مرحلہ

(۳)

محمد یوسف گورایہ، ریسرچ فیلو "ادارہ تحقیقات اسلامی"

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت اور بعد میں یہ مسئلہ اپنی پوری شدت کے ساتھ سامنے آیا۔ یہ مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے قریشی عربوں اور غیر قریشی عربوں کے تعلق کی حیثیت رکھتا تھا، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جو مجموعی طور پر عربوں کی نفسیات و عادات سے پوری طرح واقف تھے، قریشی عربوں اور دوسرے عربوں کے مسئلے کو سلجھانے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن ان کے بعد جب عربوں اور غیر عربوں کا مسئلہ درپیش ہوا تو ان کے جانشینوں سے یہ مسئلہ کامیابی کے ساتھ حل نہ ہوسکا، یہ جانشین ایک طرف تو مفتوحہ اقوام کی معاشرت عادات و خصائل اور رسوم و رواج پر پوری طرح احاطہ نہ کرسکنے کی وجہ سے ان کی مجموعی نفسیات سے پوری طرح واقف نہ ہوسکے، جو عربوں اور غیر عربوں کے امتزاج کے لیے بنیادی چیز تھی۔ دوسری طرف خود عربوں کی خانہ جنگیوں نے انہیں اس بات کی فرصت بھی نہ دی کہ وہ اس بنیادی مسئلے کی طرف توجہ دے سکیں۔ عربوں اور غیر عربوں کے امتزاج کے راستے کی یہ دونوں رکاوٹیں تقریباً نصف صدی تک بدستور قائم رہیں، اور اس دور میں "مقننہ" کی وحدت میں انتشار پیدا ہوتا رہا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کے دورِ خلافت کے آخری سالوں سے لے کر عبدالملک بن مروان کے عہد میں حضرت عبداللہ بن زبیر کی شہادت سنہ ۷۳ھ تک یہ پورا دور مسلسل خانہ جنگیوں کا دور ہے۔ خانہ جنگیوں کا یہ سلسلہ مدینہ میں حضرت عثمان کی شہادت سے شروع ہوکر پورے عراق کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، جمل کی جنگ ابھی ختم ہی ہونے والی تھی، کہ صفین کی زبردست تیاریاں شروع ہوگئیں۔ صفین میں صحابہ کے خون کی ندیاں ابھی بہہ ہی رہی تھیں کہ نہروان کا معرکہ کارزار شروع ہوگیا، اور یہ اس وقت ختم ہوا جبکہ حضرت علیؓ کو موت کی نیند سلا دیا گیا، ان کی شہادت کے فوراً بعد، عراق و شام دوبارہ معرکہ آرائی کے لیے شب و روز تیاریوں میں مصروف ہوگئے، اگرچہ حضرت حسن نے صلح کرکے متحارب فوجوں کو

باہم لڑنے سے بچالیا، لیکن آئندہ چند سالوں میں جن میں حضرت معاویہ نے حکومت کی، درحقیقت متحارب گروہوں کو موقع ملا کہ وہ باقاعدہ سیاسی اور مذہبی فرقوں میں منظم ہوجائیں اور موقع ملتے ہی خون کی ندیاں بہا دیں۔

حضرت معاویہ کی وفات کے ساتھ ہی بنو امیہ، شیعہ اور خوارج پوری تیاریوں کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف فیصلہ کن معرکہ آرائی کے لیے تیار تھے، اس کا آغاز مدینہ کی تباہی سے ہوا، اور پھر مکہ اور عراق منظم طور پر بنو امیہ کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے میدان جنگ میں کود پڑے، یزید کے بعد بنو امیہ کی حالت زار نے عبداللہ بن زبیر کے لیے کامیابی کے راستے صاف کیے، لیکن مروان بن حکم کی زیر قیادت زاب کی خونریز جنگ نے مروان کے بعد عبدالملک بن مروان کو موقع دیا کہ وہ پہلے پورے عراق میں خانہ جنگیوں کا صفایا کرے اور بعد میں حجاج کی زیر کمان مکہ میں عبداللہ بن زبیر کے خاتمے کے بعد پورے حجاز کو مطیع و فرمانبردار بنائے، چنانچہ ۳۵ھ سے ۷۳ھ تک بجز امیر معاویہ کے عہد کے چند آخری سالوں کے، پورے کا پورا دور خانہ جنگیوں میں گزرا، اور ایسا موقع میسّر نہ آسکا جس میں "مقننہ" کی وحدت کے لیے دوبارہ کوشش ہوتی،

عربوں اور غیر عربوں کے امتزاج کی راہ میں جو دوسری رکاوٹ حائل تھی، وہ مفتوحہ اقوام کے عادات و خصائل اور معاشرت، معیشت اور سیاست سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ ہونا تھی، دراصل رکاوٹ کا یہ سبب مسلسل خانہ جنگیوں کی وجہ سے پیدا ہوا، اس دور میں مفکّرین اور مجاہدین میں امتیاز نہیں تھا، جہاد مذہبی فریضے کی حیثیت سے زاہد و عابد پر بھی اسی طرح فرض تھا جس طرح عام دنیادار اور سیاسی و اقتصادی میدانوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے کے لیے۔ اس لیے جہاد غیر مسلموں کے خلاف ہو، یا سیاسی اور مذہبی عصبیت کی وجہ سے خانہ جنگی ہو، ہر مسلمان کا فرض تھا کہ اس میں عملی طور پر شریک ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ جو ذہین طبقہ (INTELLIGENTZIA) یا مفکّرین (THINKERS) کا رول ادا کر سکتے تھے، مجبور تھے کہ مجاہدین کی صف میں بھی کھڑے ہوتے، اس لیے خانہ جنگیوں کے اس دور میں ایسا طبقہ معرض وجود میں نہ آسکا، جو مفتوحہ اقوام کے سیاسی، معاشرتی، اور اقتصادی حالات کا بغور مطالعہ کر کے، اسلامی اور عربی اصولوں کو غیر عربی نفسیات پر منطبق کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں اور غیر عربوں کے اختلاف کی خلیج روز بروز وسیع ہوتی گئی، اور غیر عربوں کی اسلامی تعلیمات سے واقفیت نے، جو مسلمانوں میں مساوات کی حامی تھیں، غیر عرب مسلمانوں کو اپنے بنیادی حقوق کے حصول کے مطالبے کی شدت میں تیز تر کر دیا۔

جدید اصطلاحات کی رو سے، اگر اس زمانے کی سیاست پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا، کہ غیر عرب مسلمان،

اس دور میں دراصل حزبِ اختلاف کی حیثیت اختیار کر رہے تھے۔ اور عربوں کی سیاست پر اجارہ داری کی وجہ سے حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ اس لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کی جدید اصطلاحات کی مشابہت، اسلامی تاریخ میں اس وقت پیدا ہوئی جبکہ مسلمانوں کے برسرِ اقتدار طبقے نے مفتوحہ اقوام کو، حقوق دینے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ ایک طرف تو مفتوحہ اقوام کو اپنی قدیم اعلیٰ تہذیب و ثقافت پر ناز تھا، اور دوسرے وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں مساوی حقوق کی حوصلہ افزائی پاتے تھے، لیکن برسرِ اقتدار طبقے کی سیاست پر اجارہ داری کی وجہ سے وہ اپنے حقوق کی بجا آوری کو محال دیکھتے تھے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر، انہوں نے "مدرسے" (۸۹) کی راہ اختیار کی، اور وہ سیاست میں ناکامی کے بعد، علمی طور پر عربوں پر تفوق حاصل کرنے کی طرف مائل ہوئے، اور اس راستے سے وہ رائے عامہ کو حکومت کے خلاف ہموار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ عرب اپنی خانہ جنگیوں میں مصروف تھے۔ اور غیر عرب مسلمان مسلسل علمی اور فکری ذرائع سے اپنے حقوق کی بجا آوری کے لیے کوشاں تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب عرب اپنی خانہ جنگیوں سے فارغ ہوئے، تو انہیں معلوم ہوا کہ اس دوران زمین ان کے پاؤں سے نکل چکی تھی۔ اور غیر عرب مسلمان اپنی خفیہ اور علمی کاوشوں میں کامیاب ہو کر اب اس قابل ہو چکے تھے کہ عربوں کی سیاست پر اجارہ داری کے ناقابلِ برداشت بوجھ کو اتار پھینکیں۔ اور جب غیر عربوں کا سیاست پر غلبہ ہوا تو بنو امیہ کے، جو عربوں کے نمائندہ خاص تھے، مُردوں تک کو معاف نہیں کیا گیا۔

اسلامی تاریخ کے اس پس منظر سے یہ معلوم ہوا کہ شیخین حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کے دورِ خلافت کے بعد سے بنو امیہ کے خاتمے تک اسلامی سلطنت میں دو رُخی پالیسی پیدا ہو گئی، ایک طرف برسرِ اقتدار طبقہ تھا، جو حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے مختلف مقامات اور مختلف حالات کے پیشِ نظر قانون سازی کرتا تھا، اس کے نامزد کردہ عہدے دار مختلف علاقوں کے مخصوص معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کے مطابق قانون بناتے اور ان پر عمل کرتے اور کرواتے تھے۔ دوسری طرف ایک دوسرا طبقہ، جو برگشتہ نہ سہی، یقیناً حکومت کا معاون نہ تھا، اپنے طور پر قانون سازی میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ ابن المقفع نے جس کی حیثیت ایک طرح سے سٹیٹ سیکرٹری کی تھی اس پوری صورتِ حال کی امیر المومنین ابو جعفر المنصور کو خطاب کر کے یوں وضاحت کی۔

" امیر المومنین کے لیے جو مسائل غور طلب ہیں، ان میں متناقض احکام کا اختلاف ہے، جو انتہائی سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔ قصاص، ازدواجی تعلقات اور مالی معاملات میں یہ اختلاف بڑی نازک شکل اختیار کر چکا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک نفس کی حرمت اور ازدواجی رشتہ جو حیرہ میں حلال قرار پاتے ہیں، وہی کوفہ میں حرام

ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی اختلاف خود اندرونِ کوفہ ہو رہا ہے، یہاں ایک محلے میں ایک چیز حلال ہے اور دوسرے میں وہی حرام ہے اسی لیے ان متناقض احکام پر عمل ہو رہا ہے، اور ایسے قاضیوں کے ذریعے ان کے فیصلے ہوتے ہیں، جن کے احکام نافذ اور جاری و ساری ہوتے ہیں، اس کے باوجود حال یہ ہے کہ اہل عراق اور اہل حجاز میں کوئی بھی جماعت ایسی نہیں جو اپنے طریقوں پر نازاں و فرحاں نہ ہو، اور جو اپنے سوا دوسروں کی روایات کا مذاق نہ اڑاتی ہو۔ اس صورت حال سے یہ شکل پیدا ہو گئی ہے، کہ جو بھی عقلمند اسے سنتا ہے، اسے اس سے دکھ پہنچتا ہے" (۹۰)

قانون سازی کی اس دورخی پالیسی کے سنگین نتائج کے پیش نظر بنو عباس کے ابتدائی خلفاء نے کوشش کی کہ وہ اس خلیج کو پاٹیں، جو ان سے پہلے ایک صدی کے دوران پیدا ہو گئی تھی۔ بنو عباس کی اس تحریک کے پیچھے بہت سے عوامل میں سے دو سب سے عامل تھے۔ ایک یہ کہ انہوں نے غیر عرب مسلمانوں کا تعاون اس شرط پر حاصل کیا تھا کہ وہ عربوں کی سیاسی اجارہ داری کے خلاف ان کی مدد کریں گے، اور اب کامیابی کے بعد ان کا فرض تھا کہ وہ ایسا لائحہ عمل مرتب کریں جس میں تمام مسلمانوں کے مساوی حقوق کی بنیاد پر ضابطہ حیات ترتیب پائے۔ اور دوسرے مقننہ انتظامیہ اور عدلیہ کے منتشر نظام سے جو عملی دشواریاں پیش آ رہی تھیں وہ اس بات کی متقاضی تھیں کہ کوئی ایسا متفق علیہ لائحہ عمل مرتب ہو، جس پر مسلمانوں کا اتفاق ہو تا اس داعیہ کے پیش نظر ابن المقفع کی تجویز پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا گیا، اور ابتدائی خلفائے بنی عباس میں بعض نے (۹۱) امام مالک بن انس پر زور دیا کہ وہ اس ضرورت کو پورا کریں، اور خاص طور پر ہدایت کی کہ وہ ایسی کتاب ترتیب دیں جو جامع ہو، جس میں افراط و تفریط نہ ہو، جس میں عبداللہ بن عمر کے شدائد، عبداللہ بن عباس کی رخصتیں اور عبداللہ بن مسعود کے شواذ شامل نہ ہوں، اوسط الامور کو ملحوظ رکھیں، اور ایسا راستہ بتائیں جو صحابہ اور آئمہ کا مجتمع علیہ ہو (۹۲) جس کے جواب میں امام مالک نے الموطا تیار کی، جو کسی حد تک مندرجہ بالا ضروریات کو [illegible] تھی، اگرچہ امام صاحب نے کتاب تو تیار کر دی اور خلفاء نے اسے پسند بھی کیا اور اسے پوری سلطنت میں بطور قانون نافذ بھی کرنا چاہا لیکن امام صاحب نے اسے نافذ کرانے سے گریز کیا، دراصل پوری امت کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنے کا کام کسی ایک فرد کے بس میں نہ تھا، اس کام کے لیے ضروری تھا کہ پوری سلطنت کے تمام علاقوں کے معاشرتی، معاشی اور ثقافتی حالات کا جائزہ لیا جاتا، اور اس جمع شدہ معلومات کے ذخیرے کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھال کر ایک ضابطہ حیات ترتیب پاتا، بنو عباس نے حالات سے مجبور ہو کر اس کی تحریک کی، لیکن جو طریقہ انہوں نے اس کام کی انجام دہی کے لیے اختیار کیا وہ یقیناً اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی ایک فرد کی آراء کو، جو یقیناً اس وسیع و عریض سلطنت کے ایک مخصوص علاقے اور مخصوص حالات کی آئینہ دار تھیں، انہیں پوری سلطنت کے تمام علاقوں اور

تمام حالات پر منطبق نہیں کیا جاسکتا تھا، اس سلسلے میں جہاں ایک طرف بنو عباس کے خلفاء کی کوتاہ نظری سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اس بار گراں کو فرد واحد پر ڈالنے کی کوشش کی، وہاں دوسری طرف امام مالک کی بصیرت اور وسعت نظری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، کہ انہوں نے اپنی ذاتی برتری علمی تفوق اور فقہی علو کو دوسروں پر ٹھونسنے کی بجائے مشورہ دیا کہ چونکہ مسلمان اپنے اپنے مخصوص علاقوں میں پیدا ہونے والی مخصوص فقہ پر گامزن ہوگئے ہیں، اس لیے بہتر نہیں کہ ایک خاص خطۂ حجاز کی فقہ کو شام، عراق، ایران، مصر، افریقہ، اندلس اور سندھ کے مختلف اور مخصوص حالات کا جائزہ لیے بغیر ان پر ٹھونس دیا جائے (۹۲) بنو عباس نے اس سلسلے میں جو بڑی غلطی کی، وہ یہ کہ انہوں نے امت میں ایک سو سال کے طویل عرصے میں پیدا ہونے والی وسیع دعریض خلیج کو پاٹنے کا جو طریقہ اختیار کیا۔ بڑا خام تھا اور اتنی بڑی ذمہ داری کو ایک فرد کے کندھوں پر ڈال کر وہ اس سے بری الذمہ نہیں ہوسکتے تھے، ہمارے خیال میں اگر اس مسئلے کو اس طرح سلجھایا جاتا جس طرح یہ الجھا تھا تو نتیجہ اچھا برآمد ہونے کی توقع تھی، جیسا کہ ہم نے دیکھا اس میں پیچیدگی اور الجھاؤ اس وقت پیدا ہوا، جب کہ "مقننہ" حکومت کے وظائف ثلاثہ میں سے ایک مستقل وظیفہ ہونے کے بجائے دو حصوں میں بٹ گیا، ایک طرف حکومت اپنا حکومتی کاروبار چلانے کے لیے عملی ضروریات کے تحت قانون سازی کر رہی تھی۔ دوسری طرف "غیر آئینی" طور پر بعض افراد اسی مشغلے میں مصروف تھے۔ دوہری قانون سازی کا یہ طریقہ عہد رسالت اور عہد حضرات ابوبکر و عمر میں ناپید تھا، چنانچہ مسئلے کا حل یہ تھا کہ "مقننہ" کی اس دورخی پالیسی کو ختم کرکے اس میں یک جہتی اور وحدت پیدا کی جاتی۔ اور "مقننہ" کو "غیر آئینی" ہاتھوں سے چھین کر پھر سے حکومت اسلامیہ کا ایک باقاعدہ اور مستقل وظیفہ قرار دیا جاتا اور یہ مقننہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت معاملات میں تغیر و تبدل کو پیش نظر رکھ کر اسلامی اصولوں کی بنیاد پر قانون سازی کرتی۔ مجلس قانون ساز کے ارکان کا انتخاب جدید طریق انتخاب کی طرح چونکہ اس زمانے میں ممکن نہیں تھا، اس لیے صورت حال سے نمٹنے کے لیے یہ طریق کار عین ممکن اور عملی تھا کہ خلیفہ مختلف علاقوں کے نامور فقہاء کو نامزد کرکے انہیں ارکان مجلس قانون ساز قرار دیتا، یہ مجلس قانون ساز سلطنت کے لیے ہر علاقے کی ایک تو نمائندہ ہوتی، اور دوسرے قانون سازی میں یک جہتی اور وحدت پیدا کرتی، مثلاً عراق سے امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت، سفیان بن سعید ثوری، شریک بن عبداللہ النخعی، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، ابویوسف یعقوب بن ابراہیم، زفر بن ہذیل بن قیس کوفی، محمد بن حسن شیبانی حجاز سے: امام مالک بن انس اور مدینہ اور مکہ کے دوسرے فقہا، مصر سے ابو محمد عبداللہ بن وھب بن مسلم قرشی، ابوعبداللہ عبدالرحمن بن القاسم العتقی، اہل افریقہ اور اندلس میں سے: ابوعبداللہ زیاد بن عبدالرحمٰن القرطبی الملقب بشبطون، شام سے ابوعبدالرحمن بن محمد الاوزاعی وغیرہ۔ وغیرہ۔ ان سب فقہا اور اسی طرح کے

دوسرے علماء کو بنو عباس کے ابتدائی خلفاء میں کوئی خلیفہ بجائے صرف امام مالک کو دعوت دینے کے نامزد کرکے ایک مجلس میں جمع کر دیتا اور ان سے یہ کام لیتا۔ اس سے ایک طرف تو مقننہ حکومت کا ایک وظیفہ قرار پاتی جس سے بننے والا ہر قانون پوری سلطنت میں نافذ ہوتا، اور دوسرے دورخی پالیسی ختم ہوتی جس کی وجہ سے پوری سلطنت انتشار اور فساد کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ بد قسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور خلفاء بنو عباس نے فقیہ حجاز امام مالک کو دعوت دے کر اپنے آپ کو اس اہم فریضے کی انجام دہی سے بری الذمہ سمجھ لیا۔ اگرچہ بنو عباس کی یک جہتی کی تحریک ان کی اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی، لیکن اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ امام مالک کی تقلید میں سلطنت کے مختلف علاقوں کے فقہاء نے اپنے اپنے علاقے کی فقہ کی تدوین کی طرف توجہ دی۔ اور اس طرح علاقائی طور پر فقہ حجاز، فقہ عراق، فقہ شام اور فقہ مصر مدون ہو گئیں کاش بنو عباس ان غیر آئینی "صوبائی اسمبلیوں" کی فقہ کو "آئینی اسمبلیاں" قرار دے کر ایک "قومی اسمبلی" کی تشکیل دے دیتے اور ان "صوبائی اسمبلیوں" کی فقہ کو "قومی اسمبلی" کی فقہ بنانے کی طرف توجہ دیتے، اس سے نہ صرف اس وقت کی ضرورت پوری ہوتی بلکہ اسلامی فقہ کی تاریخ کا آج نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔

مقننہ کو حکومت کا باقاعدہ وظیفہ بنانے کا یہ سنہری موقع بنو عباس نے کھو دیا اور اس وقت سے موجودہ دور تک اس وسیع پیمانے پر یک جہتی اور ہمہ گیری پیدا کرنے کا دوبارہ موقع امت کو کبھی نصیب نہ ہو سکا، اگرچہ اسلامی ممالک کے مختلف فرمانرواؤں نے کبھی کبھی اپنے اپنے ملکوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر علاقائی فقہ کی جمع و تدوین کے لیے مختلف کوششیں کیں۔ خلیفہ مامون کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے باقاعدہ ایک مرکزی جماعت تشکیل دی تھی۔ امیر علی کا بیان ہے: مامون کے عہد میں ایک باقاعدہ کونسل آف سٹیٹ معرض وجود میں لائی گئی جس میں سلطنت کے ہر علاقے اور ہر ملت کی نمائندگی موجود تھی، عوام کے نمائندوں کو اپنی آراء کے اظہار کی مکمل آزادی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شورائی بحث و مباحثہ میں ان خیالات پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی" (۹۵) ظاہر ہے کہ یہ کونسل ان حضرات پر مشتمل نہ تھی جو بنو امیہ کے عہد میں قائم ہو جانے والے "نظام مدرسہ" کے نمائندے تھے۔ بلکہ یہ عوام کے نمائندہ تھے جن کا انتخاب خلیفہ کی صوابدید پر منحصر تھا۔ اور جو حکومت کے ساتھ وفاداری کا عہد باندھتے تھے، اس دور میں اور اس کے بعد آل بویہ، سامانیہ سلجوقیہ اور ایوبیہ کے عہدوں میں ایسی مشاورتی کونسلیں ہوتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ نظام مدرسہ بھی چلتا رہا۔ اس نظام کو چلانے کے لیے حکومت نے اسے اپنی تحویل میں لیا اور اس کے اساتذہ اور مدرسین کا تقرر حکومت کے مشورے سے ہوتا تھا۔ جیسا کہ نظام الملک نے اس سلسلے میں نام پیدا کیا۔ پھر یہ لوگ کبھی بھی حکومت کی پالیسیوں اور اس کی حکمت عملیوں کی راہ میں حائل نہیں ہوئے۔ اگر کوئی مدرسہ حکومت کی تحویل سے باہر بھی تھا تو

مدرسہ یا اس کے متعلقین متعلقہ حکومت کے قانون یا اس کی پالیسیوں کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بنے۔

قیام پاکستان کے بعد اس سرزمین کے مسلمان ایک بالکل نئی صورت حال سے دوچار ہوئے، حکومت برطانیہ نے آزادی کے وقت جو چیزیں ورثہ میں چھوڑیں، ان میں ایک اسمبلی کا ادارہ بھی تھا۔ دورِ جدید کی اسمبلی اپنی جدید اصطلاح کے مفہوم اور مقصد کے اعتبار سے حکومت اسلامیہ کا کبھی بھی باقاعدہ اور آزادانہ وظیفہ نہیں ... رہی تھی، جب کہ آج تقریباً ہر ملک میں وظائف ثلاثہ میں سے اسمبلی ایک باقاعدہ مستقل اور آزاد ادارہ ہے، جہاں عوام کے منتخب نمائندے جمع ہو کر پورے ملک کے لیے قانون سازی کرتے ہیں۔ چونکہ مجلسِ قانون ساز یا اسمبلی ایک نہایت مفید، اہم اور کارآمد ادارہ تھی۔ جس کی افادیت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں، اس لیے آزادی کے بعد پاکستان کے تمام مسلمانوں نے اس کی آئینی حیثیت اور ضرورت کو تسلیم کیا، چنانچہ جب پاکستان کا مطالبہ ہوتا ہے یہی ادارہ سب کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔

اسمبلی کی اس افادیت اور اہمیت کے اعتراف کے باوجود ملک میں مسلمانوں کا ایک طبقہ اس کی کارگزاریوں سے بیزاری کا اظہار کرنے لگا، اور اس سے اسمبلی کے نمائندوں اور خصوصاً حکومت کے بارے میں جس کے وظائف ثلاثہ میں سے اسمبلی بھی ایک وظیفہ تھی، سخت معاندانہ رویہ اختیار کیا، حتیٰ کہ وہ علانیہ مخالفت پر اتر آیا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسمبلی سے پاس ہونے والے ہر قانون کی مخالفت کرنا اس نے اپنا فرض خیال کیا، پاکستان میں اس طبقے کے معرضِ وجود میں آنے کے بہت سے عوامل اور پیچیدہ اسباب تھے، بہرحال ملک میں ایک طبقہ سیاسی اغراض کے پیشِ نظر اسلامی قانون کے نام سے ملکی قانون سازی کے ادارے کے متوازی ظاہر ہونے لگا، اور آخر میں اس نے ملک کے بیشتر مذہبی افراد کو بھی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی، قرونِ اولیٰ میں عربوں اور غیر عربوں کی کش مکش نے ایک طبقے کو جنم دیا۔ جس کے تکلیف دہ نتائج قانون سازی کی دورخی پالیسی پر منتج ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ایسی کوئی وجہ موجود نہ تھی کہ دوہری قانون سازی کی تاریخ کو دوہرانے کا موقع ملتا، کیونکہ یہاں عربوں اور غیر عربوں کے درمیان غیر مساوی حقوق کی وجہ سے کسی خاص طبقے کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوئی تھی، ہر فرد، ہر جماعت اور ہر طبقے کو آئینی طور پر منتخب ہو کر قانون سازی میں حصہ لینے میں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی حتیٰ کہ عورتوں تک کو حق دیا گیا تھا اور ان کے لیے نشستوں تک محفوظ تھیں، پھر اسمبلی کا ایک نہایت مفید ادارہ موجود تھا، جس میں ہر فرد اپنی آواز بلند کر سکتا تھا۔ اور اکثریت کو اپنی رائے کا قائل کر کے قانون سازی کو اکثریت کی خواہش کے مطابق کرا سکتا تھا۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان تمام آسانیوں کے باوجود بعض افراد کی طرف سے ایسے خیالات کا اظہار ہونے لگا جو اتفاق و اتحاد کی جگہ افتراق و انتشار کے حامی

تھے۔ اور انہوں نے جب اپنے خیالات اور خواہشات کی تکمیل جمہوری اور شورائی نظام سے پوری ہوتی نہ دیکھی تو انہوں نے ماضی کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "پاکستانی اور اسلامی قانون سازی" میں فرق کر کے عوام کو ایک عجیب و غریب ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ ذیل میں ہم اس کے اسباب و علل کا جائزہ لیتے ہیں۔

اسمبلی کی آئینی حیثیت و اہمیت کے اعتراف کے بعد جب ملک میں عام انتخابات ہوئے اور ملک کے منتخب نمائندے قانون سازی کے لیے مجلسِ قانون ساز میں پہنچے۔ تو وہ حضرات جو جمہوری طریق پر کامیاب نہ ہو سکے، ملک کے آئینی اور جمہوری نمائندوں پر نکتہ چینی کرنے لگے، ان کے اعتراض کا سب سے بڑا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ نمائندگان اسمبلی اس کے اہل نہیں کہ وہ اسلامی قانون سازی کا کام انجام دے سکیں، ان کے خیال میں نمائندگان اسمبلی چونکہ اسلام کے بنیادی مآخذ سے واقف نہیں لہٰذا وہ اس کی قانون سازی کا کام انجام دے سکنے کے اہل نہیں۔ انہوں نے اس بنیادی نقطے پر نمائندگانِ اسمبلی کی نااہلیت پر زبردست تنقید کی، لیکن وہ محض نکتہ چینی سے آگے نہ بڑھ سکے، دوسری طرف اسمبلی کی آئینی حیثیت چونکہ انہیں بھی تسلیم تھی اور اس کے وجود اور اس کے مقصد کے خلاف وہ باقاعدہ بغاوت کرنے کی جرأت نہ کر سکے، اس لیے نمائندگان اسمبلی اپنے کام میں مصروف رہے اور اسمبلی کی کارروائی ملک کا باقاعدہ قانون بنتی چلی گئی۔

شروع شروع میں یہ طبقہ صرف نمائندگان اسمبلی کی نااہلیت پر ہی سب سے زیادہ معترض تھا اور اس نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ اسلامی علوم سے ناواقف لوگ اسلامی قانون سازی کا حق ادا کرنے کے اہل نہیں لیکن جب اسمبلی کی عملی کارروائی جاری رہی اور وہ قانون کا جامہ پہن کر خود ان پر نافذ ہونے لگی۔ تو اب ان کے لہجے میں ایک نیا تغیر پیدا ہوا، وہ یہ کہ "نمائندگان اسمبلی" اسلامی علوم سے عاری ہونے کی وجہ سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں نااہل ہیں، اس لیے ملک میں قانون سازی کا حق صرف ان لوگوں کو ہے، جو اسلامی علوم سے واقف ہیں۔ اور پھر کچھ دیر بعد اس نظریے میں تیسری ترقی یہ ہوئی کہ ملک میں اسلامی علوم سے واقف صرف وہ خود ہیں۔ اس لیے ملک میں قانون سازی کا حق صرف انہیں ہے۔ لہٰذا جو کچھ وہ کہیں وہ قانون ہوگا، اور جس کی وہ مخالفت کریں وہ قانون نہیں ہوگا، جب تک اس نظریے کو گول مول صورت میں پیش کیا جاتا رہا عوام کی ہمدردیاں بیشک ان کے ساتھ تھیں۔ جب اس نظریے کو صاف صاف الفاظ میں یوں بیان کیا گیا کہ اسلامی علوم سے واقفیت صرف "انہیں" ہی ہے اس لیے قانون سازی کا حق صرف "انہیں" کو پہنچتا ہے تو عوام میں زبردست اضطراب پیدا ہوا، ایک طرف وہ اسمبلی کی آئینی حیثیت تسلیم کر کے اس کی طرف سے بننے والے قوانین پر عمل کرنے پر مجبور تھے۔ اور دوسری طرف وہ ان "حضرات" کا جو ان کے ماضی کا نمائندہ ہونے کے دعویدار تھے احترام پر بھی مجبور رہے۔ لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ کس قانون کا وہ دل سے احترام

کریں نمائندگانِ اسمبلی کے قانون کا، یا "ان" کے قانون کا! حقیقت یہ ہے کہ صورتِ حال اب تک اسی طرح پر قائم ہے، اور اگر کوئی مؤثر اقدام نہ کیا گیا تو عوام "دوہری وفاداری" کے تقاضے دیر تک پورے نہ کر سکیں گے۔

ہم اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے یہ چند تجاویز پیش کرتے ہیں،

۱۔ عوام کو دورِ جدید میں اسمبلی کی آئینی حیثیت، ضرورت اور اہمیت کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچائی جائیں اور انہیں اس کی عملی افادیت اور دورِ جدید میں اس کے صحیح مقام سے زیادہ سے زیادہ واقف کرایا جائے۔

۲۔ ملک میں "دوہری قانون سازی" کے نقصانات اور اس کے ہولناک نتائج سے عوام کو روشناس کرایا جائے اور نظامِ قانون سازی میں وحدت کی افادیت اور اہمیت کا احساس عوام میں بیدار کیا جائے۔

۳۔ عوام کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ مجلسِ قانون ساز کے اصل مالک، اور نمائندگانِ اسمبلی کو منتخب کرنے والے، دراصل وہ خود ہیں، اس لیے جسے وہ قانون سازی کا اہل سمجھیں اور جس قسم کی قانون سازی وہ چاہیں اس قسم کے نمائندے منتخب کریں۔

۴۔ ملک میں جو فرد یا گروہ یا جماعت اپنے آپ کو ملک کی مقننہ کا سب سے زیادہ اہل سمجھتی ہو، اسے چاہیے کہ انتخاب کے وقت وہ اپنے آپ کو مجلسِ قانون ساز کے لیے اُمیدوار کھڑا کرے اور خود کو منتخب کروا کر آئینی طور پر اپنی اہلیت سے قانون سازی کا فریضہ انجام دے،

ہمارے خیال میں اگر ان چار نقاط پر عمل کیا جائے تو ملک میں موجودہ ذہنی انتشار کا کچھ نہ کچھ مداوا ضرور ہو سکیگا۔
وہ حضرات جو اسلام کی آڑ میں اپنے سیاسی مقاصد کی بجا آوری چاہتے ہیں ان سے درخواست کی جائے کہ بیسویں صدی میں قانون سازی کا کام بہرحال مجلسِ قانون سازہی انجام دے گی، اس لیے اگر وہ دوسروں کی نسبت اپنے آپ کو اس کیلئے زیادہ اہل سمجھتے ہیں تو آئینی اور تعمیری طریقِ کار کے مطابق انتخاب کے وقت اسمبلی کے امیدوار کی صورت میں اپنے آپ کو پیش کریں، منتخب ہو جانے کی صورت میں تو بہرحال وہ اپنی اہلیت سے کام لے کر قانون سازی کا کام کریں، اور ناکامی کی صورت میں مذہب کو آڑ بنانے کے بجائے، اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لیں۔ اور سمجھیں کہ عوام انہیں قانون سازی کے لیے اپنا نمائندہ بنانا پسند نہیں کرتے۔

عوام جو دراصل "دوہری وفاداری" کے چکر میں پھنس کر سب سے زیادہ پریشانی اور مشکل میں گرفتار ہیں ان کے لیے بھی اس طریقِ کار سے اطمینان اور آسانی کی راہ نکل سکتی ہے۔ الیکشن کے وقت صوبائی یا قومی اسمبلی کی نمائندگی کے امیدوار کے لیے جو شرائط پوری کرنا ضروری ہیں، ان کی زد کسی طرح بھی ان حضرات پر نہیں پڑتی جو انتخاب کے وقت تو امیدوار

کھڑے نہیں ہوتے اور انتخاب کے بعد مجلس قانون ساز کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، بلکہ بلا امتیاز ملک کے ہر شہری کا حق ہے۔ کہ وہ اسمبلی کا ممبر بننے کا امیدوار ہو سکتا ہے۔ اور جو لوگ اپنے آپ کو دوسروں کی نسبت نہ صرف امیدواری بلکہ ممبری کا سب سے زیادہ اہل سمجھتے ہیں، بدرجہ اولیٰ حق رکھتے ہیں کہ وہ امیدوار کھڑے ہوں' اور اگر امیدواری اور انتخاب میں اتنی آزادی کے باوجود کوئی فرد اپنے آپ کو امیدوار نہیں بناتا اور عوام کو موقع نہیں دیتا کہ وہ اسے منتخب کر کے اس کی اہلیت سے فائدہ اٹھائیں، تو ایسی صورت میں عوام کو بھی ایسے افراد کیساتھ وفاداری کے بارے میں نظرِ ثانی ہوگی۔ اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ انتخاب میں مواقع کی فراوانی اور آسانی کے باوجود ملک کے وہ افراد جو اپنی اہلیت کا دوسروں کی نسبت زیادہ اعلان کرتے ہیں، وقت پر کیوں آگے نہیں آتے' اور انہیں کیوں موقع نہیں دیتے کہ وہ اپنی وفاداری کا ثبوت عملاً ان کو منتخب کر کے پیش کریں۔ اگر ہم قیامِ پاکستان سے اب تک کی تاریخ پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جو حضرات اپنی "اہلیت" کا زیادہ اعلان کرتے ہیں، موقع آنے پر انہوں نے انتخاب میں امیدوار ہونے کی "نا اہلیت" کا دوسروں کی نسبت سب سے زیادہ ثبوت دیا' اور جن حضرات نے کوشش کی بُری طرح ناکام ہوئے۔ انتخاب میں حصہ نہ لینے والے حضرات درحقیقت اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتے ورنہ اتنے وافر مواقع کے موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ممبری کے لیے امیدوار کھڑا نہ کریں، اس صورتِ حال سے کم از کم عوام پر یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ "اہلیت" کا کیا معیار ہے۔ وقت سے پہلے اس کا ڈھنڈورا پیٹنا یا وقت آنے پر اس کا ثبوت دینا؟

اپنی تاریخ کے اس پس منظر میں نمائندگانِ مجلس قانون کے مخالفین اور عوام کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ ہر کام کے انجام دینے کے کچھ نہ کچھ قواعد ہوتے ہیں کچھ تقاضے ہوتے ہیں' اور جب تک وہ پورے نہ ہوں اہلیت کا دعویٰ پورا نہیں ہوتا۔ کسی فن سے مجرد واقفیت ہی اس بات کی دلیل نہیں ہوتی کہ فن سے واقفیت رکھنے والا اس عملی طور پر انجام دینے کا بھی اہل ہے۔ پریکٹس اور تھیوری میں بہرحال فرق ہے' واقفیت اور واقفیت کو عملی جامہ پہنانے کی اہلیت دو مختلف چیزیں ہیں' ہمارے خیال میں عوام اس بنیادی نقطے سے واقف ہیں' اس لیے باوجودیکہ وہ ایسے حضرات کا احترام کرتے ہیں ان کے ساتھ وفاداری کا اظہار بھی کرتے ہیں، لیکن انہیں عملی طور پر ممبری کے لیے انتخاب کے میدان میں آنے کا مشورہ نہیں دیتے، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ انہیں ان قواعد وضوابط اور ان علوم سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا جو واقفیت کو عملی طور پر انجام دینے کی اہلیت میں بدل سکتے ہیں۔

آخر میں ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ کشمکش اور ذہنی انتشار کا حل صرف اس میں ہے کہ مقننہ کو پھر سے خلافتِ راشدہ کی طرح حکومت کا باقاعدہ وظیفہ قرار دیا جائے۔ موجودہ مقننہ بہرحال انتظامیہ اور عدلیہ سے

الگ ہوگی جیسی کہ یہ ہے۔ اور اس کے خلاف ہر وہ ادارہ انتظام یا افراد جو اس کے متوازی "مقننہ" کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہوں، انہیں غیر آئینی قرار دے کر عوام کو "دوہری وفاداری" کے بارِ گراں سے نجات دلائی جائے۔ ملک کے بعض افراد جو اپنے آپ کو مقننہ کے لیے سب سے زیادہ اہل سمجھتے ہوں، عوام کے سامنے انتخاب کے لیے اپنے آپ کو امیدوار پیش کر کے اور منتخب ہو کر عوام کی طاقت اور اپنی اہلیت کی دوہری قوت سے قانون سازی کا کام انجام دیں۔ اور ناکامی کی صورت میں دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لیں۔ اور حقیقت کو سمجھیں کہ قیادت کے انداز ہر زمانے میں مختلف ہوتے ہیں اور خصوصاً دورِ جدید میں قانون سازی کے کچھ ضابطے ہیں جنہیں پورا کیے بغیر نہ تو قانون سازی جیسے اہم فریضہ سے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے اور نہ عوام اس کے بغیر کوئی قیادت تسلیم کرتے ہیں،

حوالہ جات و حواشی

۸۹۔ یہاں "مدرسے" سے مراد حکومت کے وظائف ثلاثہ (مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ) کے باہر غیر آئینی طور پر حکومت کو تختۂ مشق بنانے کے لیے درس و تدریس کا سلسلہ ہے۔

۹۰۔ ابن المقفع، الرسالۃ فی الصحابۃ، محمد کرد علی، رسائل البلغاء، القاہرۃ ۱۳۵۴ھ ص ۱۲۹

۹۱۔ تاریخ میں یہ مسئلہ متنازع فیہ ہے کہ خلفائے بنی عباس میں سے کس نے امام مالک بن انس کو مؤطا تیار کرنے کی درخواست کی تھی الزرقانی نے مقدمہ شرح المؤطا ص ۶ تا ص ۸ پر مختلف روایات درج کی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خلیفہ جس نے یہ درخواست کی تھی، ابو جعفر المنصور تھا حاجی خلیفہ، کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ۱۹۴۳ء، استنبول ص ۱۹۰۸ پر طبقات ابن سعد کے حوالے سے زرقانی کے خیال کی تائید کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبۃ الدینوری نے اپنی کتاب 'الامامۃ والسیاسۃ' ۱۳۴۸ھ، ص ۱۵۵ پر مفصل بحث کی ہے، اور اس روایت کو ابو جعفر المنصور کی طرف ہی منسوب کیا ہے۔

۹۲۔ الزرقانی، مقدمہ شرح المؤطا۔ فی روایۃ ان المنصور قال ضع ھذا العلم و دوّن کتاباً و جنب شدائد ابن عمر و رخص ابن عباس وشواذ ابن مسعود واقصد اوسط الامور وما اجمع علیہا الصحابۃ والائمۃ"

۹۳۔ ابن سعد، طبقات، حاجی خلیفہ کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ۱۹۴۳ء، استنبول ص ۱۹۰۸

فقلت یا امیر المؤمنین لا تفعل ھذا فان الناس قد سبقت الیہم اقاویل وسمعوا احادیث ورووا روایات واخذ کل قوم بما سبق الیہم، ودانوا بہ فدع الناس وما اختار اھل کل بلد منہم لانفسہم کذا فی عقود الجمان۔